

Meaningfulness of *Istiftā* and *Fatwā*: An Exemplary Study of some Family Issues of *Fatāwā Muftī Mahmūd*

Saeed ur Rahman ♦

ABSTRACT

The fatwā is a legal opinion of a mufti. It is intended to elucidate the legal issue at the request of an inquirer. A mufti primarily concentrates on the question of the inquirer without indulging into its context and prevailing circumstances. It is called *comprehension of hukm*. But sometimes the mufti tends to investigate about the situation of inquirer which is called *comprehension of situation*. In this article some legal fatāwā from *Fatāwā Muftī Mahmūd* are taken into consideration for evaluation the meaningfulness between *fatwā* and *istiftā*.



Chairman, Professor, Islamic Studies, Bahauddin Zakariya University, Multan. (chairmanislamicstudies@bzu.edu.pk)

استفتا اور فتوے کے باہمی تعلق کی معنویت: فتاویٰ مفتی محمود کے عائلی مسائل کا نمودجی مطالعہ

سعید الرحمن ﴿﴾

انسان میں اپنی ذات اور اپنے گرد و پیش کے بارے میں جانے اور درپیش مشکلات سے عہدہ برآ ہونے کی جتنی شروع دن سے موجود ہے، اور اسی وجہ سے انسان کے لیے حصول علم کا جذبہ فطری قرار پاتا ہے۔ چنانچہ رسول اللہ ﷺ نے طلب علم کو ہر مسلمان کا فریضہ قرار دیا،^(۱) اور حصول علم میں سوال کو بنیادی اہمیت حاصل ہے کہ اس سے انسان کوئی معلومات تک رسائی کا موقع ملتا ہے، اور پھر ایسا سوال جس کے جواب سے انسان کو اپنی سماجی زندگی میں بہتری لانے کا موقع ملے اور زیادہ اہمیت رکھتا ہے۔ قرآن حکیم اہل ایمان کو سوال کے بارے میں انگیخت کرتا ہے۔ ﴿فَسَأَلُوا أَهْلَ الْذِكْرِ إِنْ كُنْتُمْ لَا تَعْلَمُونَ﴾^(۲) نیز حدیث نبوی میں ”إِنَّمَا شَفَاعَ الْعَيْنِ السُّؤَالُ (بے شک لا علی کا علاج پوچھنے میں ہے۔)^(۳) کہہ کر سوال کی اہمیت کو واضح کیا گیا ہے، سوال کی ایک مخصوص صورت ”استفتا“ کے نام سے جانی جاتی ہے، جس کا استعمال درپیش مسئلے میں شرعی رہنمائی کے حصول کے حوالے سے ہوتا ہے اور اس طرح کے سوال کے جواب میں اسلامی شریعت کی مطلوبہ قابلیت رکھنے والے فرد یا ادارے کی جانب سے جو رہنمائی دی جاتی ہے وہ ”فتاویٰ“ کہلاتی ہے۔ فتویٰ اور استفتا کا باہمی تعلق بہت واضح ہے اور ان دونوں کے مطالعے ہی سے درست خطوط پر اسلامی شریعت سے استفادہ ہوتا ہے۔

چیرین / پروفیسر، علوم اسلامیہ، بہاء الدین زکریا یونیورسٹی، ملتان۔
(chairmanislamicstudies@bzu.edu.pk)

۱۔ محمد بن یزید ابن ماجہ، سنن ابن ماجہ، أبواب العلم، باب فضل العلماء والحدث على طلب العلم، (دار

إحياء الكتب العربية)، ۱: ۸۱، رقم ۲۲۲۔

۲۔ القرآن ۱۶: ۳۳۔

۳۔ ابو داؤد سليمان بن اشعث البجتاني، سنن أبي داؤد، كتاب الطهارة، باب المجرور يتيم (دار الرسالة العالمية،

رقم ۳۳۶۰)، رقم ۲۰۰۹۔

مفتی، فتویٰ دیتے وقت سائل کے سوال یعنی استفتا کو پیش نظر رکھتا ہے، استفتا کی نوعیت بسا واقعات نہایت سادہ ہوتی ہے کہ سائل یا مستفتی، محض کسی معاہلے کی شرعی حیثیت دریافت کرتا ہے، گویا اس کا تعلق محض شرعی علم کا حصول ہوتا ہے، مثلاً جیسے یہ سوال کہ طلاق کی شرعی حیثیت کیا ہے؟ اس طرح کے سوال کے جواب میں مفتی طلاق کی شرعی حیثیت کو مختلف صورتوں کے حوالے سے بیان کر کے سائل یا مستفتی کے علم میں اضافہ کرے گا؛ گویا مفتی کے سامنے ان صورتوں کے عملی اطلاق کی نوعیت نہیں ہو گی اور اب یہ مستفتی پر منحصر ہے کہ وہ درپیش صورت حال میں اس جواب سے کس طرح استفادہ کرتا ہے۔ اس طرح کے جواب میں مفتی کمکل طور پر اپنی دینی معلومات پر انحصار کرتا ہے اور ان معلومات کی وسعت اور نوعیت کے مطابق وہ جواب مہیا کرتا ہے، لیکن بسا واقعات استفتا میں درپیش صورت حال کا تذکرہ کر کے مفتی سے اس حوالے سے رہنمائی مطلوب ہوتی ہے، اس صورت میں مفتی پر دونیادی ذمے داریاں عائد ہوتی ہیں: پہلی توجیہ ہے کہ وہ استفتا میں بیان کردہ صورت حال کا تجزیہ کرے؛ یہ فقه الحادثہ کہلاتا ہے اور پھر اس کی روشنی میں شریعت کی رہنمائی سے آگاہ کرے، اس کو فقه الحکم الشرعی کہا جاتا ہے اور یہ دونوں امور بنیادی اہمیت کے حامل ہیں۔

اگر مفتی، استفتا میں بیان کردہ صورت مسئلہ کو نظر انداز کر دیتا ہے یا اس کے حوالے سے درست تجزیہ نہیں کرتا تو اس صورت میں اس کے فتوے پر ”متعلقہ“ ہونے کے سوالات اٹھ سکتے ہیں، کیوں کہ محض کسی شرعی حکم کی نشان دہی مفتی کے فرائض منصوب میں شامل نہیں، بلکہ مستفتی کا بیان اور اس کے گرد و پیش واقفیت اس کے لیے ازبس ضروری ہے، اسی بنا پر کہا گیا ہے: ”من جهل بأهل زمانه فهو جاهل۔“^(۴) گویا مفتی کے لیے اپنے دور کے لوگوں کے رجحانات فکر و عمل سے واقفیت کا ہونا ضروری ہے اور اسی بنا پر معروف فتویٰ نگار فتحیہ علامہ ابن عابدین الشامی (م ۱۸۳۶ء) کہتے ہیں کہ مفتی یا قاضی کا مقتول روایات کے ظاہر پر جود احتیار کرنا اور واضح قرآن اور لوگوں کے حالات سے ناواقف رہنا بہت سے حقوق ضائع کرنے اور لوگوں کی اکثریت پر ظلم کے مترادف ہے۔^(۵)

۴۔ محمد امین ابن عابدین الشامی، شرح عقود رسم المفتی، ترجمہ: سعید احمد پالن پوری (کراچی: مکتبہ البخاری، (س۔ن))،

جب کوئی مستفتی، استفتا پیش کرتا ہے تو اس میں ذکر کردہ بیانات کی توثیق و تصدیق مفتی کے ذمے نہیں ہوتی اور اس کو بیانات ہی پر انحصار کرنا ہوتا ہے، لیکن مفتی کو اس امر کو ذہن میں رکھنا ضروری ہوتا ہے کہ ان بیانات کا پس منظر کیا ہے، اور معاشرے کے عرف و عادات کیا ہیں تاکہ وہ مستفتی کو درست خطوط پر رہنمائی دے سکے۔ علامہ ابن قیم الجوزیہ (۱۵۷ھ) کہتے ہیں: ”ینبغي له أن يكون فقيها في معرفة مكر الناس و خداعهم و احتيالهم و عوائدهم و عرفياتهم، فإن الفتوى تتغير بتغير الزمان والمكان والعوائد والأحوال، وذلك كله من دين الله.“^(۱) (مفتی کے لیے یہی مناسب ہے کہ وہ لوگوں کے مکروہ فریب، ان کے حیلے بہانے اور ان کی عادات و رواجات کو جاننے میں گہرا فہم رکھنے والا ہو کہ فتویٰ، زمان و مکان اور عادات و حالات کے بدلتے سے بدل جاتا ہے اور یہ تمام امور، اللہ کے دین کا حصہ ہیں۔)

لہذا فتوے کے لیے یہ امر ناگزیر قرار پاتا ہے کہ مفتی کو استفتائیں مذکور معاملات کا گہرا ادراک حاصل ہو، کیوں کہ اس کے بغیر اس کا جواب کتابی مطالعے کے مطابق تو ہو سکتا ہے مگر وہ فتوے کے تقاضوں پر پورا نہیں اترے گا، چنانچہ ابن قیم وضاحت کرتے ہیں: ”فالواجب شيء، والواقع شيء، والفقیه من يطبق بين الواقع والواجب، وينفذ الواجب بحسب استطاعته، لا من يلقي العداوة بين الواقع والواجب، فلكل زمان حكم، والناس بزمانهم أشبه بآباءهم.“^(۲) (شرعی طور پر) واجب حکم ایک امر ہے اور واقعہ (در پیش صورت حال) بھی ایک امر ہے۔ فقہہ کامہرو ہی ہوتا ہے جو در پیش صورت حال اور (شرعی) واجب حکم کے درمیان ہم آہنگی قائم کرتا ہے اور واجب حکم کو حتی الامکان نافذ کرتا ہے، ایسا شخص نہیں ہوتا جو در پیش صورت حال اور واجب حکم کے درمیان عداوت و بعد پیدا کر دے کہ ہر زمانے کا ایک حکم ہوتا ہے اور لوگ اپنے زمانے کے لحاظ سے اپنے آباء اجداد کے ہی زیادہ مشابہ ہوتے ہیں۔)

بر صغیر پاک و ہند میں بالعموم فتوے کے لیے نجی مذہبی تعلیمی اداروں میں قائم دارالافتاء کے فتوے کو اہمیت دی جاتی ہے، اس ضمن میں ان کی علمی خدمات لائق تحسین اور ان کی شخصیات قابل احترام ہیں اور ان تعلیمی

۶۔ محمد بن ابی بکر ابن قیم الجوزیہ، إعلام الموقعين عن رب العالمين (بیروت: دار إحياء التراث العربي، ۲۰۰۱ء)،

۱۷۳:۳

۷۔ نسخ مصدر، ۱۸۶۔

اداروں یا مدارس یا ان میں کام کرنے والے مفتی حضرات کی ساکھ کی بنیاد پر ان کے فتاویٰ کو پذیرائی حاصل ہوتی ہے۔ آج بھی عالیٰ معاملات بالخصوص نکاح و طلاق کے مسائل کے حوالے سے بالعموم مفتی حضرات کی طرف رجوع اور ان پر اعتماد کیا جاتا ہے، جس کے سبب اس کے مقابلے میں سرکاری قانون بھی بسا اوقات اپنی مطلوبہ اہمیت حاصل نہیں کرپاتا۔ اس تناظر میں ان حضرات پر بھاری ذمے داری عائد ہو جاتی ہے کہ وہ اپنے مستقتوں خواتین و حضرات کی متوالن رہنمائی سے عہدہ برآ ہوں؛ کیوں کہ مفتی اور غیر مفتی عالم کے مابین ایک واضح فرق یہ ہے کہ غیر مفتی عالم کی رائے اپنے علم کی بنیاد پر ہوتی ہے اور اس کا اس امر سے کوئی تعلق نہیں ہوتا کہ اس کی رائے کو کتنی وقعت حاصل ہوگی، چنانچہ اس کی رائے سے اختلاف یا اتفاق ایک علمی موضوع ہوتا ہے، جب کہ مفتی کی رائے کے بارے میں تاثر یہ ہے کہ وہ مستقتوں پر اثر انداز ہوتی ہے کہ وہ مفتی پر اعتماد کرتے ہوئے اپنے متعلقہ امور طے کرتا ہے اور اپنے حدود کا رکھ کر تعین کرتا ہے، حتیٰ کہ بسا اوقات اس سلسلے میں راجح قانون اور عدالتی فیصلہ کے مقابلے میں فتوے کو اساسی حیثیت دے کر اس کے مطابق عمل کرتا ہے۔

بر صغیر کے مطبوعہ فتاویٰ میں دو انداز کے فتوے پائے جاتے ہیں: ایک تو وہ فتاویٰ ہیں جن میں مفتی نے اپنی دانست کے مطابق محض رائے دینے پر اکتفا کیا اور اس سلسلے میں کسی دلیل یا حوالے کی ضرورت محسوس نہیں کی اور اس کی وجہ واضح ہے کہ عام طور پر مستقتوں کو شرعی حکم سے غرض ہوتی ہے اور وہ مفتی کے فہم پر اعتماد کرتا ہے۔ اور اسی کے ساتھ بعض استفتارات (شرعی سوال) کے جواب میں مفتی نے مفصل گفتگو کی ہے اور اس کے فتوے میں بالعموم گذشتہ دور کے معروف مجموعہ ہائے فتاویٰ کے حوالہ جات موجود ہوتے ہیں، جن سے وہ اپنے نقطہ نظر کی تائید حاصل کرتا ہے۔

بر صغیر پاک و ہند میں جو فتاویٰ کے مجموعے منظر عام پر آئے ہیں ان میں سے اکثر یا تو کسی معروف مذہبی شخصیت سے نسبت رکھتے ہیں جیسے فتاویٰ رشیدیہ، مولانا رشید احمد گنگوہی (م ۱۹۰۵ء) کے فتاویٰ کا مجموعہ ہے، یا کسی دینی تعلیمی ادارے کا عنوان رکھتے ہیں، جیسے فتاویٰ دارالعلوم دیوبند یا ان کی نسبت کسی مسلک کی طرف ہے جیسے فتاویٰ اہل حدیث وغیرہ، اور اس طرح کے فتاویٰ کو ان شخصیات یا اداروں یا ممالک سے عقیدت رکھنے والے حلقوں میں پذیرائی حاصل ہے، لہذا ان حلقوں میں دریافت کیے جانے والے سوالات کے جوابات میں بسا اوقات ان فتاویٰ پر انحصار کرتے ہوئے ان کے جوابات کو من و عن نقل کر دیا جاتا ہے اور شرعی دلائل بلکہ ماضی کے ذخیرہ فتاویٰ کی طرف مراجعت یا ان کے تجوییے کی ضرورت بھی محسوس نہیں کی جاتی، لہذا بر صغیر کے مطبوعہ فتاویٰ کے مواد

(استفتاؤ جواب استفتا) کی علمی تجزیے کی ضرورت ہے تاکہ ان سے استفادے اور استدراک کی صورت واضح ہو سکے۔

اکیسویں صدی میں پاکستان میں منظر عام پر آنے والے مجموعہ ہائے فتاویٰ میں ایک نمایاں نام فتاویٰ مفتی محمود^(۸) کا ہے۔ مولانا مفتی محمود پاکستان کی معروف مذہبی حیثیت اور سیاسی شخصیت کے مالک تھے۔ وہ جنوری ۱۹۱۹ء کو پنیوالہ (ڈیرہ اسماعیل خاں) میں پیدا ہوئے، آپ کے والد محترم خلیفہ محمد صدیق قندهار (افغانستان) سے نقل مکانی کر کے آئے تو خانقاہ یاسین زئی کے بزرگ مولانا سید عبدالعزیز شاہ نے آپ کو جائے سکونت فراہم کی، مفتی صاحب نے ۱۹۲۰ء میں جامعہ قاسمیہ شاہی مراد آباد سے دینی تعلیم کمل کی۔ بعد ازاں وہ اپنے علاقے میں تدریسی ذمے داریاں ادا کرنے لگے، یہاں تک کہ ملتان آکر مدرسہ قاسم العلوم سے بطور مدرس (بعد از یہ شیخ الحدیث و صدر مفتی) وابستہ ہو گئے۔ انہیں ملکی سیاست میں نمایاں مقام حاصل رہا، وہ پاکستان کی آئین ساز اسمبلی کے منتخب رکن تھے جس نے ۱۹۷۳ء کا متفقہ دستور مظکور کیا تھا۔ وہ صوبہ سرحد (خیبر پختونخواہ) کے وزیر اعلیٰ اور قومی اسمبلی میں قائد حزب اختلاف بھی رہے۔ آپ رابطہ عالم اسلامی کے رکن بھی رہے، ۱۹۷۹ء میں کراچی میں وفات پائی۔^(۹)

مفتی محمود عجیب اللہ نے ۱۹۵۰ء سے ۱۹۷۵ء تک کے عرصے کے دوران میں تقریباً بائیس ہزار فتاویٰ جاری کیے۔ اس سلسلے میں ان کے صاحبزادے مولانا فضل الرحمن وضاحت کرتے ہیں کہ ”ان فتاویٰ جات میں بہت سے فتاویٰ پر حضرت والد صاحب کے نام کے بجائے دیگر مفتیان کرام کے نام درج ہیں، اس کی وجہ یہ ہے کہ حضرت والد صاحب اپنی انتہائی مصروفیات کی بنا پر جب خود فتویٰ نویسی کی فرصت نہ پاتے تو معین مفتی^(۱۰) کو سپرد فرما دیتے۔ معین مفتی، حضرت مفتی صاحب کی ہدایت کے مطابق فتویٰ تحریر کرتے اور مفتی صاحب کی زبانی یا تحریری

-۸- یہ مجموعہ فتاویٰ ۲۰۰۱ء میں پہلی بار زیر طباعت سے آراستہ ہوا، اس کی اب تک سات جلدیں طبع ہو چکی ہیں اور چار ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں، اس کو حافظ محمد ریاض درانی نے جمعیۃ پلی کیشنا ہور سے شائع کیا، مولانا نعیم الدین کی رہنمائی میں مولانا عبدالرحمن اور مولانا نعیم اللہ نے اس کی ترتیب و تبویب کا کام کیا جبکہ مولانا محمد عرفان اس کی تصحیح کی ذمے داری سے عہدہ برآ ہوئے۔ مولانا مفتی محمود، فتاویٰ مفتی محمود (لاہور: جمیعہ پلی کیشنا، ۱۹۷۰ء)، ۱: ۳۵۔

-۹- نفس مصدر، مقدمہ مولانا محمد جبیل خاں، ۱: ۱۲۲ اور بعد۔

-۱۰- معین مفتی کے طور پر مولانا فضل الرحمن نے مولانا سید عبدالرحمن ابا خیل، مفتی احمد جان پنیوالہ، مفتی عبداللطیف عبدالخیل اور مفتی محمد کے علاوہ مفتی محمد عبداللہ (استاذ حدیث و مفتی جامعہ خیر المدارس) کے ناموں کی نشان دہی کی ہے (مصدر سابق، ۱: ۳۲) جب کہ ان کے علاوہ اس مجموعہ فتاویٰ میں مفتی محمد انور شاہ اور مفتی محمد احسان حاکمی ذکر موجود ہے۔

صدقی کے بعد اسے جاری کرتے، اس لحاظ سے یہ حضرت مفتی صاحب ہی کے فتاویٰ ہوئے۔^(۱۱) گوہاری رائے میں اس مجموعہ فتاویٰ کا نام ”فتاویٰ قاسم العلوم ملستان“ رکھا جاتا تو زیادہ موزوں ہوتا۔ زیر نظر مضمون میں فتاویٰ مفتی محمود میں مذکور چار عائلی موضوعات سے متعلق حنفی نقطہ نظر سے دیے گئے فتاویٰ کا ان کے متعلقہ استفتاءات کے پس منظر میں ایک نمودجی جائزہ پیش کرنا مقصود ہے تاکہ فتوے اور استفتا کی باہمی معنویت واضح ہو سکے۔

۱۔ ولایت و کفاءت:

کم سن بچیا پنچی کے نکاح کے حوالے سے جمہور فقہاء، جس میں چاروں معروف فقہی ممالک کے اصحاب شامل ہیں، کافی نقطہ نظر جواز کا ہے، اور وہ صغير کے نکاح کرنے کا اختیار اس کے ولی کو دیتے ہیں۔^(۱۲) حنفی نقطہ نظر سے کمن کی ولایت نکاح بالترتیب باپ، دادا، بھائی اور بچپان کے بعد والدہ کو حاصل ہوتی ہے، تاہم فرق یہ ہے کہ حنفی فقہاء باپ، دادا کے کیے ہوئے نکاح کو ناقابلٰ تفہیم قرار دیتے ہیں،^(۱۳) چنانچہ ان کے ہاں کم سن کو بلوغت کے بعد اس نکاح کو ختم کرنے کا اختیار نہیں ہوتا، لیکن اگر یہ ثابت ہو جائے کہ باپ دادا نے اس اختیار کو کم سن کے مفاد کے بر عکس استعمال کیا تو ایسی صورت میں بلوغت کے بعد عدالت کے ذریعے تفہیم نکاح کا حق حاصل ہوتا ہے،^(۱۴) اس حوالے سے متعلقہ استفتا اور فتویٰ ملاحظہ ہو:

-۱۱۔ نفس مصدر۔

-۱۲۔ فقہاء تابعین میں سے عثمان الحنفی (م ۱۴۳۳ھ) اور عبدالله بن شبر مدد (م ۱۴۲۲ھ) کے علاوہ ابو بکر عبد الرحمن الاصم (م ۱۴۰۱ھ) کی رائے میں قبل از بلوغت نکاح کا شرعی جواز نہیں ہے۔ (دہبۃ الزہلی، الفقہ الاسلامی و ادلهہ (بیروت: دارالفکر (س-ن))، ۷: ۲۷۹۔

-۱۳۔ ابو الحسن علی بن ابی بکر المغینانی، المداہیۃ (ملستان: مکتبہ شرکتہ علمیہ (س-ن))، ۲: ۳۱۷۔

-۱۴۔ علامہ علاء الدین حسکفی (حصکفی ۸۸۰ھ) کہتے ہیں کہ اگر باپ دادا کا اختیار غلط استعمال کرنا معروف ہو تو ان کا کیا ہوا نکاح صغار درست نہ ہو گا، ان کے الفاظ ہیں: وَإِنْ عَرَفَ لَا يَصْحُ النِّكَاحُ اتفاقاً، وَ كَذَا لَوْ كَانَ سَكْرَانَ فِزْوَجَهَا مِنْ فَاسِقٍ أَوْ شَرِيرٍ أَوْ فَقِيرٍ أَوْ ذِي حِرْفَةٍ دِينَةٍ لَظَهُورٍ سَوْءَ اخْتِيَارٍ فَلَا تَعْرَضْهُ شَفَقَتُهُ الْمُظْنَوَةُ۔ (علاء الدین الحسکفی، الدر المختار شرح تنویر الأبصار (کراچی: ایم ایم سعید کمپنی (س-ن))، ۳: ۲۷۶۔

استفتہ:

کیا فرماتے ہیں علماء دین دریں مسئلہ کہ ایک لڑکی کا نکاح صغر سنی میں والد نے ایسے مقام پر کر دیا جو کہ نہایت ظالم، اب اس، بد معاش، عصمت فروش، بے عزت، بے مروت، بے غیرت و بے پردہ پھر نے پر مجبور کرنے والا ہے۔ اس شخص کی ایک اور منکوحہ بھی ہے جو کہ نہایت شریف ہے، لیکن وہ ظالم اس بے چاری کو اتنا تنگ کرتا ہے کہ مجبور ہو کر میکے چلی جاتی ہے، اپنے خاوند کے گھر آباد ہونے کا نام تک نہیں لیتی، ایسے آدمی سے صغیرہ کا نکاح ہو چکا تھا مگر اب صغیرہ جوان ہونے کے بعد جب حالات سے آگاہی ہوئی تو کہتی ہے میں ایسے ظالم کے گھر مطلق آباد نہیں ہوں گی۔ اب لڑکی کے ورثا مجبور ہیں، ان حالات میں کیا طلاق لی جاسکتی ہے، تنسخ کرانا جرم تو نہیں، جو فیصلہ شریعت کا ہو تحریر فرمادیں۔ بینوا تؤجروا۔

فتوى:

ایسے بد دین آدمی سے لڑکی کو الگ کرنا چاہیے یا تو وہ طلاق دے دے اور اگر وہ طلاق نہیں دیتا تو کسی مسلمان حاکم کی عدالت کے ذریعے شرعی ضابطے کو اختیار کر کے عدالتی حکم حاصل کیا جائے۔ واللہ تعالیٰ اعلم^(۱۵) زیر نظر فتوے میں درست تناظر میں عدالتی تنسخ کی شرعی حیثیت تسلیم کرتے ہوئے اسے اختیار کرنے کی رائے دی گئی ہے، فقہ حنفی میں ایسے ولی کے اختیارات، سوے استعمال کے سبب عدالتی نظر ثانی کے دائرے میں آجاتے ہیں^(۱۶) گوفتوے میں اس کی کوئی نشان دہی نہیں کی گئی اور نہ ہی اس شرعی ضابطے کی وضاحت کی گئی ہے جس کے تحت عدالتی حکم حاصل کیا جائے؛ تاہم اگر باپ، دادا کے علاوہ کسی اور رشتہ دار نے کم سن پچے یا پچھلے کا نکاح سماجی حیثیت (کفاءت) اور خاندانی مہر (مہر مثل) کو ملموڑ رکھتے ہوئے کیا تو وہ نکاح اور فقہی طور پر صحیح تصور کیا جاتا ہے مگر ایسی صورت میں انھیں خیار بلوغ حاصل ہوتا ہے۔ اس تناظر میں ولایت نکاح اور خیار بلوغ کے بارے میں استفتہ کے پس منظر میں متعلقہ فتوے کا مطالعہ پیش ہے۔

-۱۵- مفتی محمود، فتاویٰ مفتی محمود، ۷: ۲۳۔

-۱۶- الحصنی، مصدر سابق، ۳: ۲۷۔

استفتا:

جناب مفتی صاحب! درج ذیل مسئلے میں شریعت اسلامی کے مطابق آپ کی رائے درکار ہے۔ ایک لڑکی کی پیدائش والد کی وفات سے تقریباً چھے ماہ بعد ہوئی۔ لڑکی ابھی نابالغ تھی کہ اس کے بڑے بھائیوں نے باہمی مشورے سے لڑکی کو شادی کی غرض سے اس نابالغ لڑکی کا نکاح صرف زبانی طور پر پڑھ دیا جس میں لڑکی کی والدہ اور سب سے بڑے بھائی کی رضامندی شامل نہ تھی۔

بعد ازاں لڑکی اپنی والدہ کے ہاں رہی اور جوان ہوئی۔ نکاح کرنے والے بھائیوں کے والدہ کے ساتھ تعلقات کشیدہ رہے اور لڑکی کے جوان ہونے پر جب اس سے ازدواجی زندگی کے بارے میں پوچھا گیا تو اس نے چار پانچ معترض گواہوں کی موجودگی میں سابقہ نکاح سے لتعلقی اور آئندہ زندگی کے بارے میں والدہ کے فیصلے کو قبول کرنے پر رضامندی ظاہر کی جس پر اس کی والدہ اور دو بھائیوں نے اس کے شادی کر دی اور لڑکی مذکورہ چند ماہ سے اپنے گھر آباد ہے۔

اب دریافت طلب امر یہ ہے کہ آیا والدہ کی رضامندی کے ساتھ کیا جانے والا یہ حالیہ نکاح اور شادی درست ہے یا نہ؟ کیا اب یہ لڑکی نابالغی کی حالت میں کیے جانے والے بھائیوں کے نکاح، جس میں اس کی والدہ کی رضامندی شامل نہ تھی، کی پابند تھی یا نہ؟ شریعت اسلامی کی روشنی میں واضح کیا جائے کہ نابالغ ہونے کی صورت میں کیا جانے والا زبردستی کا نکاح واقع اور منعقد ہوا تھا یا نہیں؟ فتویٰ دیا جائے۔

فتوى:

اگر نابالغہ لڑکی کا باپ دادا زندہ موجود نہ تھا تو تمام بالغ بھائیوں کو ولایت حاصل تھی، والدہ کو ولایت نہیں، لہذا تحقیق کی جائے۔ اگر بعض بالغ بھائیوں نے لڑکی کی نابالغی میں شرعی طریقے سے ایجاد و قبول کے ساتھ گواہوں کی موجودگی میں نابالغہ بہن کا نکاح کر دیا ہے تو وہ نکاح صحیح اور نافذ ہے اور خاوند سے طلاق حاصل کیے بغیر دوسری جگہ جو نکاح کیا ہے وہ منعقد نہیں ہوا۔ فقط اللہ تعالیٰ اعلم^(۱۷)

زیر نظر استفتا میں کم سن پچھی کے اولیا کے طور پر بھائیوں اور والدہ کا ذکر کیا گیا اور یہ بھی بتایا گیا کہ اس کے نکاح کے حوالے سے پچھی کی والدہ اور سب سے بڑا بھائی متفق نہ تھے جب کہ دیگر بھائیوں نے صفر سنی میں نکاح کر دیا، بعد ازاں پچھی نے بالغ ہونے پر اس نکاح سے لتعلقی ظاہر کر دی اور آئندہ کے لیے اپنی والدہ کو نکاح کا اختیار

دے دیا، گویا فقه کی زبان میں وکالت سونپ دی۔ اس صورت حال میں فتوے میں خنفی نقطہ نظر سے یہ بات تو درست ہے کہ باپ دادا کی عدم موجودگی میں نابالغ کی ولایت نکاح بھائیوں کو حاصل ہے، والدہ کو نہیں، لیکن اس بات کو زیر بحث نہیں لایا گیا کیا کہ اگر بھائیوں میں اختلاف رائے ہو تو ایسی صورت میں آیا بڑے بھائی کو اس میں ترجیح حاصل ہے۔ جیسا کہ زیر نظر صورت میں بڑے بھائی نے اپنے چھوٹے بھائیوں کے فیصلے سے اتفاق نہیں کیا یا کچھ بھائیوں کے حق ولایت استعمال کرنے سے دوسروں کا حق قائم رہتا ہے یا نہیں ہو جاتا ہے۔

اس ضمن میں خنفی فقہ کے دونوں نقطہ ہائے نظر ہیں کہ اگر کسی جگہ ایک سطح کے کئی اولیا ہوں جیسے حقیقی بھائی ہوتے ہیں اور ان میں سے کچھ نکاح پر رضامند ہوں اور کچھ نہ ہوں تو ایسی صورت میں امام ابو حنیفہ (م ۱۵۰ھ) اور امام محمد بن حسن الشیبانی (م ۱۸۹ھ) کی رائے میں دوسروں کا حق ساقط ہو جاتا ہے۔ غالباً فتوے میں اس رائے کو بنیاد بنا یا گیا ہے جب کہ امام ابو یوسف (م ۱۸۲ھ) سمیت دیگر فقہاء کے ہاں دوسرے اولیا کا حق اعتراض قائم رہتا ہے۔^(۱۸) اور دوسری بات یہ ہے کہ خنفی فقہ کی رو سے باپ دادا کے علاوہ دیگر اولیا کو ولایت نکاح صغير حاصل تو ہے، لیکن اگر وہ کفوئے ہٹ کر یا نہایت کم مہر پر نکاح کرتے ہیں تو وہ نکاح درست تصور نہیں ہو گا، لیکن اگر وہ کفاءت اور مہر مثل کا خیال رکھ کر کم سن کا نکاح کرتے ہیں تو نکاح منعقد ہو جاتا ہے، مگر ایسی صورت میں کم سن کو خیال بلوغ بروے کار لانے کا عدالتی حق حاصل ہوتا ہے، جیسا کہ علامہ علاء الدین حصافی (م ۱۰۸۸ھ) قرار دیتے ہیں:

”إن كان المزوج غير الأب وأبيه لا يصح النكاح من غير كفؤ أو بغبن فاحش أصلاً، وإن كان من كفؤ و بمهر المثل صحيحاً، ولكن لها أي للصغير والصغيرة خيار الفسخ ولو بعد الدخول بالبلوغ أو العلم بالنكاح بعده بشرط القضاء للفسخ.“ (ملخص)^(۱۹)

زیر نظر صورت میں ایسا ہی ہے، چنانچہ بچی نے بالغ ہونے کے بعد جب گذشتہ نکاح سے لتعلقی ظاہر کر دی ہے اور اس کی رضامندی سے دوسرا نکاح کر دیا گیا تو فتوے میں استفتا میں بیان کردہ صورت حال کے بر عکس یہ قرار دیا گیا کہ گذشتہ نکاح صحیح اور نافذ ہے اور خاوند سے طلاق حاصل کیے بغیر دوسری جگہ کیا گیا نکاح منعقد نہیں ہوا، جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ استفتا کو مکمل تفصیلات کے ساتھ پیش نظر نہیں رکھا گیا۔

-۱۸- الزحلی، الفقه الاسلامی و أدله، ۷: ۲۳۸۔

-۱۹- الحصافی، الدر المختار، ۳: ۶۷-۶۹۔

۲- مہر کے مسائل

اسلامی شریعت نے عقد نکاح کی اہمیت کو اجاگر کرنے اور بالخصوص اس عقد میں منسک ہونے والی عورت کی عزت افرائی اور اس کی معاشری خود انحصاری کی عالمت کے طور پر مرد کو پابند کیا ہے کہ وہ اس حوالے سے اپنی بیوی کو اس کی سماجی حیثیت کے مطابق اعزازی دے جو فقة کی اصطلاح میں ”مہر“ کہلاتا ہے، جیسا کہ ارشاد ربانی ہے: ﴿ وَءَاٰتُوا الِّسَّاءَ صَدْقَاتٍ نَّسْلَهٌ ﴾^(۲۰) چنانچہ عورت عقد نکاح کے سبب مہر کی قانونی حق دار قرار پاتی ہے۔ ذیل میں مہر سے متعلق دو فتاویٰ کا متعلقہ استفتا کے تناظر میں ایک جائزہ پیش ہے۔

(الف) استفتا:

کیا فرماتے ہیں علماء دین دریں مسئلہ کہ زید نے اپنی بالغہ لڑکی کا نکاح عمر کے بھائی سے کر دیا اور اس کے عوض میں عمر نے اپنی لڑکی کا نکاح زید کے بیٹے سے کر دیا جو اس وقت نابالغ تھی۔ نکاح کے وقت مہر کی رقم پچیس روپے حق مہر درج ہوئی، مگر کچھ عرصہ بعد عمر نے زید کے بیٹے سے ایک اقرار نامہ لکھوا لیا کہ چار بیگھے اراضی اور کچھ زیورات بے طور حق مہر دینا ہو گا حالاں کہ نکاح اور اندر ارج کے وقت پچیس روپے تھے۔
نیز واضح رہے کہ عمر نے جس لڑکے سے زمین وغیرہ لکھوا لی ہے اس لڑکے کے نام کوئی زمین وغیرہ نہیں
ہے البتہ اس کے باپ کے دست خط ثابت ہیں مگر جس کنویں کارقبہ لکھا گیا ہے اس میں بھی اس کارقبہ نہیں تو شرعاً
کون ساخت حق مہر دینا ہو گا؟ پچیس روپے یا زمین و زیورات؟

فتوى:

اگر یہ بات صحیح ہے کہ جس کنویں کارقبہ لکھ دیا گیا ہے، اس کنویں پر شخص مذکور کے باپ کارقبہ نہیں ہے تو یہ عورت صرف پچیس روپے تحریر شدہ مہر لینے کی حق دار ہے۔ زائد جو بعد میں لڑکے سے لکھوا یا گیا ہے وہ حاصل کرنے کی حق دار نہ ہوگی۔ فقط اللہ اعلم^(۲۱)

استفتا میں مذکور صورت کے مطابق عقد نکاح کے وقت مہر پچیس روپے مقرر ہوا، بعد ازیں باہمی رضامندی سے چار بیگھے اراضی اور کچھ زیورات مقرر کیے گئے، مذکورہ استفتا میں جو امور بحث طلب ہیں، ان میں سے

- ۲۰۔ القرآن: ۳: ۲۰۔

- ۲۱۔ مفتی محمود، فتاویٰ، ۵: ۳۳۵-۳۳۶ (فتوى مفتى محمد اسحاق)۔

ایک یہ کہ حنفی فقہ کے مطابق پچیس روپے کی بہ طور مہر کیا حیثیت ہے؟ دوسری کہ بعد میں مقرر کردہ مہر کی کیا نوعیت ہے؟ سوم یہ کہ جو زمین کاغذات میں لکھی گئی وہ شوہر یادست خط کنندہ باپ کی ملکیت نہیں اس کا شرعی حکم کیا ہے؟ دیسے گئے فتوے میں ان امور پر کماحتہ توجہ نہیں دی گئی، چنانچہ پچیس روپے بہ طور مہر لازم ہونے کا فتویٰ دیا گیا ہے، حالاں کہ فقہ حنفی کی رو سے کم از کم مہر دس درہم یعنی دو تو لہ ساڑھے سات ماشہ چاندی ہے،^(۲۲) جس کا اندازہ ۱۳۹۳ھ میں بیالیس روپے کیا گیا تھا،^(۲۳) جب کہ زیر نظر فتویٰ ۱۳۹۸ھ میں جاری کیا گیا جس سے یہ امر تو یقینی ہو جاتا ہے کہ پچیس روپے، دس درہم سے کم تر ہے، ایسی صورت میں یہ رقم مہربنے کی صلاحیت نہیں رکھتی۔ ایسی صورت میں مہر مثل لازم ہوتا ہے۔ جہاں تک بعد میں مقرر کیے جانے والے مہر کا تعلق ہے تو اس کو فقہ حنفی میں معتبر خیال کیا جاتا ہے جیسا کہ الہادیۃ میں اس کی نشان دہی کی گئی ہے۔ ”فَإِنْ زَادَهَا فِي الْمَهْرِ بَعْدَ الْعَدْدِ،

لزِمَتْهُ الْزِيَادَةُ۔“^(۲۴)

استفتا میں مذکور صورت کے مطابق بعد میں مقرر کردہ مہر میں ایک حصہ (زیورات) شوہر کی ملکیت ہے اور دوسرا حصہ (زمین) غیر مملوک ہے، اس حوالے سے فقہ حنفی میں تین موقوف پائے جاتے ہیں۔ امام ابوحنیفہ کی رائے میں صرف مملوک کہ حصہ ہی مہربنے گا بہ شرط کہ دس درہم سے کم نہ ہو؛ امام ابویوسف کی نظر میں مملوک کہ چیز کے علاوہ غیر مملوک کہ چیز کی قیمت بہ طور پر مہر مثل کے مساوی ہو جائے۔^(۲۵) اس اختلاف رائے کی صورت میں مفتی کو لاکن ترجیح قول کی نشان دہی کرنی چاہیے تھی تاکہ مستفتی کو واضح رہ نہ آئی مل سکے۔

(ب) استفتا:

کیا فرماتے ہیں علماء دین دریں مسئلہ کہ ایک آدمی کا نکاح ہوا۔ عورت کے عقد میں حق مہر میں پانچ تو لہ سونار کھا گیا۔ بہ وقت نکاح آدمی نے اڑھائی تو لہ سونا ادا کر دیا اور پھر عورت نے دو تو لہ سونا معاف کر دیا، پھر کچھ

- ۲۲ - نفس مصدر، ۵: ۳۱۰؛ (فتوى مفتى محمد انور شاہ)۔

- ۲۳ - نفس مصدر، (فتوى مفتى محمد عبد الله)۔

- ۲۴ - ابو الحسن برہان الدین علی بن ابی بکر المرغیانی: الہادیۃ فی شرح بدایۃ المبتدی، تحقیق: طلال یوسف (بیروت:

دار إحياء التراث العربي)، ۱: ۲۰۰۔

- ۲۵ - نفس مصدر، ۱: ۲۰۲۔

عرصے بعد مرد نے طلاق دے دی اور آدھ تو لہ سونا بھی ادا کر دیا، لیکن عورت کہتی ہے کہ میں نے وہاں معاف کیا تھا۔ یہاں معاف نہیں کرتی۔ لہذا حق مہر پورا کیا جائے تو کیا آدمی کو پورا کر دینا چاہیے یا بری ہے؟

فتاوی:

اگر یہ درست ہے کہ مذکورہ عورت نے مہر کا دو تو لہ سونا اپنے خاوند کو معاف کر دیا تو وہ معاف ہو گیا ہے۔

اب اس کا یہ کہنا درست نہیں کہ میں یہاں معاف نہیں کرتی۔ فقط اللہ اعلم ^(۲۶)

استفتا کے مطابق یہوی نے مہر کے طور پر مقرر پائچ تو لہ سونے میں سے دو تو لہ معاف کر دیا تھا، مگر طلاق کے بعد اس نے اس معافی کی وضاحت کی کہ اس نے وہاں معاف کیا تھا، یہاں نہیں، جس سے اس امر کی وضاحت ہوتی ہے کہ عقد نکاح کے باقی رہنے کی صورت میں مہر کا ایک حصہ معاف کیا گیا تھا، جب کہ طلاق کے بعد صورت حال تبدیل ہو گئی۔ یہوی کی مذکورہ وضاحت قرین قیاس ہے اور خلاف عرف بھی نہیں کہ عمومی انسانی مزاج و ماحول سے بھی مطابقت رکھتی ہے، کہ شریک حیات ہونے کے ناطے اس نے حسن سلوک اور مرمت کا اظہار کیا ہے اور جب شوہر نے قطع تعلق کر لیا تو اب وہ اس مرمت اور رواداری کا حق دار نہیں رہا۔ لہذا یہوی کی طرف سے مہر کی معافی میں طیب خاطر کا نامہ ہونا واضح ہو چکا ہے، اور طیب خاطر کے بغیر شوہر کے لیے یہوی کا مہر اپنے پاس رکھنا کسی طور درست نہیں، ارشاد خداوندی ہے: ﴿فَإِنْ طَبِّنَ لَكُمْ عَنْ شَيْءٍ مِّنْهُ نَفْسًا فَلْكُوْهُ هَنِسَّةً مَرِيْكَا﴾ ^(۲۷) جب کہ فتوے میں ظاہری الفاظ کی اساس پر یہوی کی وضاحت کو قبول نہیں کیا گیا حالاں کہ متکلم اپنی بات کی وضاحت کا نام صرف مجاز ہوتا ہے بلکہ قرینے کی بنیاد پر اس کی مشاکو اس کے الفاظ کے ظاہر پر ترجیح حاصل ہوتی ہے۔ ^(۲۸)

علامہ ابن البہام (۸۶۱ھ) کہتے ہیں کہ تحقیقی بات یہ ہے کہ پیش آمدہ واقعات کے حوالے سے مفتی میں ایک درجہ اجتہاد کی صلاحیت اور لوگوں کے احوال سے واقفیت ضروری ہے۔ ^(۲۹) اس بات کا امکان رد نہیں کیا جاسکتا کہ صاحب فتاویٰ کے اجتہاد میں یہوی کی بات بے وزن ہو، لیکن یہ امر محتاج برہان ہے۔

۲۶۔ مفتی محمود، فتاویٰ، ۵: ۳۲۶؛ (فتاویٰ مفتی محمد اسحاق)۔

۲۷۔ القرآن ۳:۳۔

۲۸۔ عبدالکریم زیدان، الوجیز فی اصول الفقه (لاہور: اسلامی اکادمی، (س۔ن))، ۳۳۳۔

۲۹۔ محمد بن عبد الواحد کمال الدین ابن البہام، شرح فتح القدیر (دارالفکر، س۔ن)، ۲: ۲۵۹۔

۳۔ نکاح شغار

پاکستان کے دیہاتی کلچر میں طے کردہ ادله بدله کی شادیوں کا رواج پایا جاتا ہے اس کو شریعت کی اصطلاح میں ”شغار“ کہا جاتا ہے کہ اس میں ایک عورت سے نکاح کو دوسرا عورت سے نکاح کا معاوضہ تصور کیا جاتا ہے اور علاحدہ علاحدہ مہر مقرر نہیں ہوتا، اس کو مقامی عرف میں ”وٹہ سٹھ“ کا نکاح بھی کہا جاتا ہے۔ اس میں نکاح کے کم زور فریق کے طور پر عورت کی رائے کو عام طور پر درخور اعتنا نہیں سمجھا جاتا ہے؛ اس حوالے سے ایک فتویٰ کا جائزہ لیا جاتا ہے۔

استفتہ:

کیا فرماتے ہیں علماء دین دریں مسئلہ کہ ایک خاندان کے افراد کے درمیان رشتہ ناتا ہوتا ہے، دونوں طرف سے لینے دینے کا وعدہ بلکہ نکاح ہو جاتا ہے۔ اب ایک لڑکی منکوحہ دار فانی سے چل بسی اور ایک لڑکی منکوحہ زندہ باقی ہے۔ اب جو لڑکی زندہ ہے اس کے ولی دینے کے لیے تیار نہیں، ان کا مطالبہ یہ ہے کہ ہم اپنی لڑکی تب دیں گے جب آپ اس کا بدل دیں، دوسرا وجہ نہ دینے کی یہ ہے کہ لڑکا چرس پیتا ہے اور بے روز گار ہے اور زانی فاحش قسم کا آدمی ہے۔ اب جو لڑکی زندہ منکوحہ ہے اس کے والدین ایسے اوباش قسم کے آدمی کو اپنی لڑکی دینا گوارہ نہیں کرتے۔ جب نکاح ہوا تھا تقریباً اس کو اٹھارہ سال ہو گئے ہیں اور سابقہ عمر یعنی نکاح کے وقت بھی اٹھارہ سال عمر تھی تو تقریباً ۳۵، ۳۶ سال ہونے والے ہیں۔ اب ہم شرع شریف کی رو سے فیصلہ چاہتے ہیں۔ اب نکاح باقی ہے اور ایسے شخص کو دینا جائز ہے؟

فتوى:

صورت مسئولہ میں اگر شرعی طریقے سے ایجاد و قبول کے ساتھ گواہوں کی موجودگی میں نکاح کیا گیا ہے تو نکاح صحیح اور نافذ ہے، جب تک خاوند طلاق نہ دے، دوسرا عرض جگہ نکاح جائز نہیں۔ واللہ اعلم (۳۰)

زیر نظر استفتا میں کئی امور وضاحت طلب ہیں:

(۱) اولہ بدله کا نکاح جس کو شرعی اصطلاح میں شغار کہا جاتا ہے، اس کی شرعی حیثیت کیا ہے کہ زیر نظر صورت میں ایک لڑکی کا نکاح دوسری لڑکی کے بدله میں کیا گیا۔ حنفی فقہ ایسے نکاح کو نافذ قرار دیتے ہوئے فریقین کو مہر مثل کا پابند بناتی ہے، جب کہ جمہور فقہا کی نظر میں ایسا نکاح فاسد ہے۔^(۳۱)

سوال یہ ہے کہ کیا زیر نظر صورت میں مذکورہ فقہی اختلاف رائے کا اطلاق ہوتا ہے؟ کیوں کہ فریقین کی باہمی رضامندی (کنواری عورت کی سکونتی رضامندی سمیت) جس صورت میں موجود تھی، اب وہ نہیں رہی کہ ایک منکوحہ کی وفات کے بعد دوسری عورت کے نکاح کی رضامندی قائم نہیں رہی جس کا متعلقہ فریق نے بر ملا اظہار کر دیا ہے لہذا ایسی صورت میں حنفی فقہ کے جواز کے موقف کا اطلاق کہاں تک درست ہو گا؟ کیوں کہ مفتی کے لیے ضروری ہوتا ہے کہ وہ عرف و روانج کو بھی پیش نظر رکھے۔

علامہ ابن عابدین الشامی، جن کے فتاویٰ پر بر صیر کے حنفی فتاویٰ پر بہت زیادہ اعتماد کیا جاتا ہے اس امر کو واضح کرتے ہیں کہ الفاظ و معاملات ہر علاقے میں وہاں کے عرف کے مطابق نافذ ہوں گے اور ان سے وہی بات مرادی جائے گی جو لوگوں کے درمیان متعارف ہے اور وہی صحت و فساد اور جواز و عدم جواز مراد لیا جائے گا جو وہاں کے لوگوں کے عرف کا تقاضا ہے، اگرچہ فقہانے صراحت کی ہو کہ الفاظ و معاملات کا تقاضا، لوگوں کے عرف کے بر عکس ہے کیوں کہ بات کرنے والا اپنے عرف و عادات کے مطابق ہی انہیں استعمال کرتا ہے اور یہی اس کی گفتگو سے مقصود ہوتا ہے اور وہ ان معانی کا خیال نہیں رکھتا جو فقہا کے پیش نظر ہوتے ہیں اور ہر شخص سے معاملہ اس مراد کے مطابق ہی ہوتا ہے اور تمام عرفی الفاظ کے اپنے اصطلاحی مفہوم ہوتے ہیں جن کے سبب حقیقی معنی، مجاز لغوی کی حیثیت اختیار کر لیتے ہیں۔^(۳۲)

(۲) نکاح کے لیے ایجاد و قبول لڑکی کے والدین نے کیا جب کہ لڑکی بالغ ہے کہ عمر اٹھارہ سال تھی، آیا اس سے اجازت لی گئی یا نہیں؟ حالاں کہ فقہ حنفی کی رو سے بالغ عورت کا نکاح اس کی اپنی اجازت کے بغیر وقوع پذیر نہیں ہوتا۔^(۳۳)

۳۱۔ المرغینانی: مصدر سابق، ۲: ۳۲۷۔

۳۲۔ الشامی، شرح عقود، ۱۲۱۔

۳۳۔ المرغینانی: الہدایۃ، ۲: ۳۱۳۔

(۳) کیا لڑکا اپنے اخلاقی عیوب کے سبب لڑکی کا کافو (ہم پلہ) ہے یا نہیں؟ کیوں کہ حنفی فقہ نے زوجین کے درمیان جن امور کفاءت کو معتبر قرار دیا ہے، ان میں دیانت یعنی دیانت داری شامل ہے گو امام محمد بن حسن اس کو امور آخرت میں شمار کرتے ہوئے احکام دنیا کے لیے معتبر خیال نہیں کرتے لیکن ان کا بھی کہنا ہے کہ اگر مرد اپنی معاشرتی ساکھ کھو بیٹھا ہے تو ایسی صورت میں وہ نیک عورت کا کافو نہیں رہتا۔^(۳۴)
اور غیر کافو میں نکاح قابل فتح شمار ہوتا ہے۔^(۳۵)

فتوے میں نہ صرف ان امور سے کوئی اعتنا نہیں کیا گیا، بلکہ بہم انداز سے جواب تحریر کر دیا گیا، جس سے فتوے کا مشاپورا ہوتا نظر نہیں آتا، کیوں کہ مستفتی کو اگر شرعی طریقے کا علم ہوتا جس کی نشان دہی فتوے میں کی گئی ہے تو اسے استفتا کی ضرورت ہی نہ ہوتی۔

۲- تفسیخ نکاح

اسلامی شریعت میں جس طرح مرد کی طرف سے طلاق کا اختیار استعمال کرنے سے عقد نکاح اختتام پذیر ہو جاتا ہے، اسی طرح کچھ صورتوں میں عدالتی اختیار سے بھی یہ عقد تحلیل ہو جاتا ہے، اس کے اسباب میں فقہا کی مختلف آراء ہیں۔ فقہ حنفی کے روایتی موقف میں عدالتی اختیار بہت محدود ہے مگر بر صغیر کے نوآبادیاتی دور میں درپیش حالات کے ناظر میں بہاں کے حنفی اہل علم نے ماکی موقف کو موزوں قرار دیا اور یہی فقیر کی ذمے داری ہوتی ہے کہ وہ حالات زمانہ کی تبدیلی پر نظر رکھے، کیوں کہ بہت سے ایسے احکام جو صاحب مسلک مجتہد نے اپنے ماحول اور زمانہ کے حالات کے حوالے سے بیان کیے ہوتے ہیں، عرف کی تبدیلی سے بدلتے ہیں۔ چنانچہ اس حوالے سے عائلی مسائل میں مولانا اشرف علی تھانوی (م ۱۹۲۳ء) کی الحیلۃ الناجزة للحلیلۃ العاجزة ایک نمائندہ حیثیت رکھتی ہے۔ ذیل میں تفسیخ نکاح کے حوالے سے استفتا کے ناظر میں ایک فتوے کا جائزہ پیش ہے۔

استفتہ:

کیا فرماتے ہیں علماء دین دریں مسئلہ کہ مسماۃ اسلم خاتون نے اپنے خاوند محمد دین کے خلاف ظلم، تشدید، مارپیٹ، نان و نفقة نہ دینے اور اس کے زیورات و پارچہ جات چھین لینے کی بنا پر عدالت میں تفسیخ نکاح کا مقدمہ دائر

- ۳۴ - نفس مصدر، ۲: ۳۲۰۔

- ۳۵ - وہبۃ الزہلی: الفقہ الاسلامی، ۷: ۸۸۔

کیا۔ عدالت نے پوری تحقیق اور شہادتوں کے اور مندرجہ بالا وجوہات کے ثبوت کے بعد تنفسخ نکاح کا فیصلہ کر دیا جس کا مکمل ثبوت موجود ہے۔ کیا اس صورت میں تنفسخ نکاح شرعاً درست ہے یا نہیں؟

فتاویٰ:

بر تقدیر صحت واقعہ یہ تنفسخ شرعاً درست نہیں ہے اور یہ عورت اپنے خاوند سے طلاق حاصل کیے بغیر دوسری جگہ عقد کرنے میں شرعاً مجاز نہیں۔ فقط والله اعلم^(۳۶)

استفتا کے بیان کے مطابق شوہر بیوی پر جسمانی تشدد، نان و نفقة نہ دینے اور بیوی کے زیورات و پارچ جات چھیننے کا مرتكب ہوا، اور یہ تمام امور عدالت کے سامنے مکمل ثبوت کے ساتھ پیش کیے گئے جس پر عدالت نے تنفسخ نکاح کا فیصلہ صادر کر دیا مگر فتوے میں اس کو شرعی طور پر درست قرار نہیں دیا گیا حالاں کہ استفتا میں اس امر کی وضاحت موجود ہے کہ ”عدالت نے پوری تحقیق اور شہادتوں کے اور مندرجہ بالا وجوہات کے ثبوت کے بعد تنفسخ نکاح کا فیصلہ کر دیا جس کا مکمل ثبوت موجود ہے۔“ فتوے میں اس امر کو مسترد کرنے کی کوئی وجہ نہیں بتائی گئی حالاں کہ حنفی فقہ، قضاۓ قاضی کے نہ صرف ظاہری طور پر نفاذ کی قائل ہے، بلکہ وہ اس کو حقیقی معنوں میں نافذ کرنے کی بھی داعی ہے اور یہ قضاۓ قاضی کے نہ صرف ظاہری طور پر فسوخ دونوں میں معتبر ہوتا ہے۔^(۳۷)

چنان چہ شیخ المہند مولانا محمود حسن (م ۱۹۱۹ء) کہتے ہیں کہ حکم قاضی، وقوع طلاق میں بلاشبہ نافذ ہو جائے گا کیوں کہ کیونکہ متناوح محل انشاء طلاق ہے اور طلاق مجملہ فسوخ بھی ہے۔^(۳۸) حتیٰ کہ اگر قاضی نے جھوٹی شہادتوں کو اپنی دانست میں سچا سمجھ کر فیصلہ کر دیا تو بھی عدالتی فیصلہ نافذ ہو جائے گا؛ کیوں کہ اس کے پاس حقائق تک پہنچنے کا کوئی اور راستہ نہیں ہے اگرچہ جھوٹے دعوے دار اور جھوٹے گواہوں پر گناہ کبیرہ کا وباں ہو گا، جب کہ زیر نظر استفتا میں بیان کردہ صورت حال کے مطابق شوہر ”متعنت“ ہے، اور ایسی صورت میں عدالت کی طرف تنفسخ نکاح کے اختیار کو عصر حاضر کے حنفی فتاویٰ میں بھی درست قرار دیا گیا ہے کہ متعنت اصطلاح شرع میں اس کو کہتے ہیں جو ضدی اور ظالم ہو جو کہ نہ عورت کو آباد کرے اور نہ طلاق دے، چنان چہ زیر نظر مجموعہ فتاویٰ میں ہی ایک اور مقام پر اس امر کا واضح طور پر ذکر ہے کہ ایسے شخص کی بیوی کو شرعاً یہ حق حاصل ہے کہ مسلم عدالت میں

۳۶۔ مفتی محمود، فتاویٰ، ۲: ۲۷۳ (فتاویٰ مفتی محمد اسحاق)۔

۳۷۔ المرغینانی: مصدر سابق، ۳: ۲۴۱۳۲۔

۳۸۔ محمود حسن، ایشانج الادله (کراچی: ایشانج سعید کمپنی، (س۔ن))، ۲۱۸۔

دعویٰ کر کے اپنے خاوند کا متعنت (ظالم) ہونا ثابت کرے، عدالت اس امر کی تحقیق کرے اور اس کے خاوند کو بلائے اور اسے مجبور کرے کہ یا تو صحیح طریقہ سے آباد کرے (اور اس سے ضمانت بھی لی جاسکتی ہے کہ وہ اپنی بیوی کو صحیح طریقہ سے آباد کرے گا) یا طلاق دے دے اور اگر نہ تو آباد کرے اور نہ طلاق دے بلکہ اپنی صدر قائم رہے تو حاکم اس کے نکاح کو فتح کر دے اور یہ حکم، طلاق کے حکم میں ہو گا، بعدہ وہ عورت عدت گزار کر دوسرا جگہ نکاح کرے۔^(۳۹)

خلاصہ کلام

- زیر نظر قاتویٰ اور ان کے استفتاءات کے پس منظر کے جائزے سے درج ذیل نتائج سامنے آتے ہیں کہ:
- ۱- مفتی کے لیے اپنی مطلوبہ علمی صلاحیت کے ساتھ ساتھ استفتائے تمام مندرجات کو ملوظ رکھنا، ان کو درست تناظر میں جانا اور ان کا صحیح اور اک کرنا ضروری ہوتا ہے کہ اس کے بغیر اس کا فتویٰ کتابی معلومات اور شخصی دانست پر تو مبنی ہو سکتا ہے مگر مستفتی کے لیے اس کا متعلقہ ہونا سوالیہ نشان ہوتا ہے۔
 - ۲- استفتائے عین جائزے سے مفتی کو زیر نظر مسئلے کے گرد درپیش اور عرف و ماحول سے واقفیت کے علاوہ، انسانی نفیات اور درپیش سماجی مشکلات کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے جو اس کی بنیادی قابلیت کا تقاضا بھی ہے، اس سے بے اعتمانی کی صورت میں مفتی اپنے فتوے میں متعلقہ سمت میں مناسب رہ نہماں نہیں کر پاتا۔ نیز اس ضمن میں خاص طور پر اسلام کے اصول یُسر و سماحت کے حوالے سے مفتی کی رہ نہماں زیادہ قابل عمل اور لا اُن توجہ بن سکتی ہے۔
 - ۳- استفتائے کو مطلوبہ اہمیت دینے سے مفتی، مستفتی کی ذہنی استعداد، اور اس کے علم و فہم کی سطح کو ملوظ رکھتے ہوئے مبہم انداز بیان سے بھی احتراز کرے گا، بہ صورت دیگر مستفتی، فتوے کی رہ نہماں سے درست خطوط پر استفادہ نہیں کر سکتا۔
 - ۴- اگر مفتی، استفتائے کے الفاظ کے عرفی مقاصد سے صرف نظر کرتا ہے تو وہ درست تناظر میں درپیش صورت حال کا جائزہ نہیں لے سکے گا اور اس کی شرعاً رہ نہماں بر محل تصور نہ ہو گی۔

- ۵۔ محض فقہی جزئیات پر مبنی افتاؤ کی کارروائی سے فتوے کے مقاصد پورے نہیں ہوتے کیوں کہ مذکورہ جزئیات اپنا مخصوص پس منظر رکھتی ہیں اور ان پر جامد انحصار سے شریعت کے معابر مقاصد متاثر ہو سکتے ہیں۔
- ۶۔ مفتی کے لیے عصری قانون سازی کو یک سر نظر انداز کر کے رائے دینا بھی محل نظر ہے، کیوں کہ اجتہادی مسائل میں قانون سازی، شرعی طور پر موثر تصور ہوتی ہے اور اپنی تفہیمی اہمیت رکھتی ہے، کہ اجتہادی امور میں قاضی کے فیصلے کی موثر حیثیت تسلیم شدہ رہی ہے۔

